۸

قانون: نوآبادیاتی نظام سے آزادی

شادریک گوٹو

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ پہلا، اس بیماری کی تشخیص جو ہمارے تعلیمی نظام میں موجود ہے اور دوسرا، ممکنہ تجاویز کہ اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا۔

میں اس امر کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ ہم قانونی ماہرین کو افریقہ اور خاص طور پر جنوبی افریقہ پر، جس کو نوآبادیاتی نظام کا حصہ بنایا گیا تھا، تنقیدی جائزے سے آگے بھی دیکھنا ہوگا۔ تنقیدی جائزہ بہت ضروری ہے لیکن ہمیں اس سے بھی آگے جانے کی ضرورت ہے تاکہ ہم ان تبدیلیوں کو صحیح جگہ پر رکھ سکیں جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے لیے دنیا میں بہتری لاسکیں جن کو ہم اپنے سابق نوآبادکاروں کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ میں نہ صرف قانون کو نوآبادیاتی دور سے آزاد کرانے کے ضمن میں اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں بلکہ میں قانون، قانونی نظام اور قانون کو برتنے والوں یعنی وکلاء اور قانون کے دیگر ماہرین پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

قانون کے اساتذہ ہونے کی حیثیت سے معاشرے میں ہمیں خصوصی مقام حاصل ہے۔ جس کا ہم زیادہ احساس نہیں کرتے، کیونکہ ہم جو قانون میں ہو رہا ہوتا ہے اس پر تحقیق، اس کا تجزیہ اور تنقید کرتے ہیں، قانون سازی کے دائرے میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے ہم اس کو دیکھتے ہیں، ہم انصاف اور عدل کے حوالے سے تمام اہم اُمور کا جائزہ لیتے ہیں اور اس طرح ہر وقت دوسرے اداروں مثلاً

عدالتوں یا قانون ساز اداروں میں ہونے والے کاموں پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم مراعات یافتہ لوگ ہیں مگر ہم کافی کام نہیں کرتے۔ اس کے برعکس ہم بہت قدامت پسند ہیں اور اس طرح مسئلے کو حل کرنے والے نہیں بلکہ مسئلے کا حصہ ہیں۔

جب ہم یورپی مرکزیت (Eurocentrism) کی بات کرتے ہیں تو یہ ایک ایسی بیماری ہے جو صرف ایک قانون میں نہیں بلکہ اس پورے قانونی اور عدالتی نظام میں گردش کر رہی ہے جو ہمیں ورثے میں ملا اور جس کا مقصد ہمیں کنٹرول کرنا اور ہمیں کچلنا تھا۔

ٹھیٹھ انگریزی قانونی نظام (اینگلو سیکسن) جو ہمیں افریقہ اور ایشیا کے برطانوی نوآبادیاتی دور میں ملا، اور شہری (دیوانی) قانون پر مبنی نام نہاد براعظمی قانونی نظام، نپولین کا ضابطہ اور اس طرح کے دوسرے قانونی نظام جو فرانسیسی بولنے والے افریقی ممالک کو حاصل ہوئے، سارے مسائل کی جڑ ہیں۔

آپ اس سوال ہی کو لے لیں کہ آیا آپ ایک مخالفانہ یا تفتیشی طرز کے قانونی نظام کو اختیار کریں گے اور اپنے آپ سے پوچھیں کہ اس نظام کے تحت لوگ کس سطح کا انصاف کریں گے؟ کیا یہ کافی ہے؟ اور کیا یہ ہماری روایتی اقدار کے نظام کی عکاسی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ؟ ان میں سے کوئی نظام بھی ایسا نہیں کرتا اور ہم پھر بھی ان کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں اور مذہبی فرض سمجھ کر ان کی پیروی کرتے ہیں!

وراثت میں ملنے والی ناانصافیاں

ہم آزادی حاصل کرنے کے بعد افریقی ممالک میں ایک ایسی صورتحال کو پاتے ہیں جس میں ہمیں مختلف قانونی نظام ورثے میں ملے ہیں۔ مجھے مثال کے طور پر جنوبی افریقہ کا نام استعمال کرنے دیجیے۔ جنوبی افریقہ کے دستور میں انسانی حقوق اور حقوق کے بل پر ایک تفصیلی باب موجود ہے لیکن جب ہم قانون کے متن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں عمومی قانون، روایتی قانون اور بین الاقوامی قانون کی طرح کے دوسرے قوانین موجود ہیں۔

پھر آپ جب یہ پوچھتے ہیں کہ یہ عمومی قانون (Common Law) کیا ہے؟ تو پتہ چلتا ہے کہ یہ عمومی قانون تو ولندیزی قانون ہے۔ اس قانون کو لاطینی لوگ درآمد کر کے جنوبی افریقہ لائے تھے اور اس کا اطلاق نمیبیا (Namibia) سوئٹزرلینڈ سے لے کر زمبابوے (Zimbabwe) تک ہوتا تھا۔ ان میں مشترک کیا چیز تھی؟ وہ نوآبادیاتی طاقتوں کے ملکی قوانین تھے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور انہوں نے ان کی نوآبادیاتی ممالک میں پیوند کاری کر دی تھی پھر بھی آج ہم کہتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو آزاد کر رہے ہیں اور ہم اپنے اس قانون کے اس حصے کو افریقی قانون سے جدا کر رہے ہیں، جس کو ہم روایتی قانون کہتے ہیں۔ مگر یہ وہ قانون ہے جس کو نوآبادیاتی دور میں مسخ کیا گیا تھا۔ ہم قانون کو پہنچنے والے اس نوعیت کے نقصان کے ازالے کے لیے کوشاں نہیں ہیں اور نہ یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس عدل کی بنیاد کیا تھی۔ ہم یہ کام نہیں کرتے اور پھر بھی ہم کہتے ہیں کہ ہم قانون کے پروفیسر ہیں اور اس طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ حقیقت میں ہم ان معاشروں کے بارے میں بڑے جذباتی ہیں جہاں ہم رہتے ہیں۔ یہ ایک مثال ہے جو کوئی شخص دے سکتا ہے اور اس کا اطلاق حقیقی طور پر افریقہ میں تمام سابق نوآبادیات پر ہوتا ہے۔

ہم اب بھی اپنے وکلاء کو عدالتوں میں عدالتی گاؤن، چغے اور اس نوعیت کا مخصوص لباس پہنے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ عدالت انصاف کی فراہمی کی جگہ ہے۔ حالانکہ ہمارے ملک کے عوام جو نوآبادیاتی قوتوں کے لوگوں کو ایسا لباس پہنتے ہوئے دیکھنے کے عادی ہیں، یہ یقین نہیں رکھتے کہ یہاں انصاف ہے۔ لیکن ہم اس کا احساس نہیں رکھتے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہی سب کچھ ہے۔ ہم اسی طرح یہاں کر رہے ہیں جس طرح وہ لندن اور نیویارک میں کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم مہذب ہیں اور وہ ہمیں تسلیم کرتے ہیں اور ہمیں ہارورڈ میں لیکچر دینے کے لیے گشتی (Visiting) پروفیسر کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ہم مسئلے کا ایک حصہ ہیں۔

ہمیں جو کچھ وراثت میں ملا تھا، اس کو تبدیل کرنے کی ہماری ناکامی کے علاوہ اب قانون کے دوسرے نئے شعبے ہیں جن کا دائرہ پوری دنیا میں پھیل رہا ہے اور ہم ابھی تک موثر طور پر نوآبادیاتی نظام

کے زیر اثر ہیں۔

میں اس کی دو مثالیں دوں گا۔ ان میں سے ایک بحر ہند میں مشرقی افریقہ کے قریب بحری جہازوں کی لوٹ مار ہے۔ اس میں ملوث گروہوں کا موقف ہے کہ ہم ایسا اپنے علاقوں کا غیر ملکیوں کی ماہی گیری کی کارروائیوں سے دفاع کی غرض سے کر رہے ہیں وہ ایک طرح سے بحری ڈاکو ہیں لیکن دوسری جانب وہ اپنے وسائل کو آزادی دلانے والے بھی ہیں۔ لیکن یہاں جو چیز اہم ہے وہ یہ کہ وہاں اس بارے میں کوئی قانون نہیں ہے اور کوئی ایسا عدالتی نظام نہیں ہے جہاں گرفتار ہونے والے صومالی لوگوں پر مقدمہ چلایا جائے۔ اس صورت میں کیا ہوتا ہے کہ کینیا اور سیشلز نے امریکہ اور یورپی یونین کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے ہیں جس کے تحت یہ مغربی ممالک ہی ان لوگوں پر مقدمہ چلاتے ہیں جن کو ان سمندری حدود میں امریکی اور نیٹو گرفتار کرتے ہیں اور اس کے عوض یہ افریقی ممالک امریکہ سے کچھ امداد حاصل کرتے ہیں۔

یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ آپ کس طرح خود کو عوام پر مقدمہ چلانے کے مرکز ہونے کی اجازت دے سکتے ہیں؟ ایک ایسے قانونی نظام کے تحت جس کا وجود ہی نہیں ہے اور جو جرم آپ کے ملک میں واقع ہی نہیں ہوا۔ دوسرے الفاظ میں آپ ایک ایسے موقع پر غیر قانونی کاموں میں مصروف ہیں جب بین الاقوامی طور پر قانون کی بالادستی کی بات کرتے ہیں۔ پھر یہی لوگ آپ کو بتائیں گے کہ کس طرح وہ ایک بین الاقوامی عدالتی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح کی باتیں۔

ایک اور مثال جرائم کی عالمی عدالت (International Criminal Court) کی ہے۔ افریقہ میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا تنازع ہو جائے تو اس کو اس عدالت میں بھیج دیا جاتا ہے لیکن اس عدالت کے قیام کے بعد امریکہ نے عراق پر حملہ کیا اور اسے تباہ و برباد کر دیا۔ عراق میں کیے جانے والے جرائم میں سے کسی کو بھی عدالت میں نہیں بھیجا گیا اور نہ ہی اس عدالت نے ان مظالم اور زیادتیوں پر کوئی کارروائی کی جو اسرائیل مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس طرح جرائم کی عالمی عدالت کو جس کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ وہ انصاف کا ایک عالمی نظام وضع کر رہی

ہے، امتیازی طور پر افریقہ کو مجرموں کے خطے کے طور پر پیش کرنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے اور ان لوگوں کو جو یہ جرائم ۱۰۰ گنا زیادہ کررہے ہیں، کسی نقصان اور سزا کے بغیر آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کیا ہم اپنے قانون کے اسکولوں میں ان باتوں کو پڑھا رہے ہیں؟ اور کیا ہمارا نصاب تبدیل کیا جارہا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔

کرنے کے کام

میں تجویز کرتا ہوں کہ پہلے ہمیں اپنے ذہنوں کو نوآبادیاتی دور سے آزاد کرنا ہوگا۔ جب تک ہم اپنے ذہنوں کو اس سے آزاد نہیں کریں گے اس وقت تک اپنے قانون اور قانونی وعدالتی نظام کو آزاد نہیں کرا سکیں گے۔ تاکہ ہمارے لوگ یہ محسوس کرنا شروع کریں کہ وہ قانون کی بالادستی کے دستوری نظام میں رہ رہے ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس قوانین ہیں مگر قانون کی بالادستی نہیں ہے۔ ہمارے پاس آئین ہیں مگر آئینی بالادستی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ آیئے قانون کے نصاب پر ایک نظر ڈالیں اور پوچھیں: کیا ہم علوم کی زمرہ بندی میں اس حد تک محدود رہنا چاہتے ہیں کہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے والے ایک شخص کو معمولی شعبوں مثلاً زراعت، سائنس یہاں تک کہ ابتدائی حساب کے امور کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔

جب آپ عدالت جاتے اور قانونی تنازعات پر بحث کرتے ہیں تو ان میں سے بعض سائنسی اور فنی معاملات، بعض ماحولیاتی اور بعض پیچیدہ مالی تنازعات کی نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن ہم جو وکیل تیار کررہے ہیں وہ نیم تعلیم یافتہ ہے۔ اگرچہ وہ مرد یا عورت اعزازات کے ساتھ گریجویشن کر چکا ہو۔ اس لیے ہمیں لازمی طور پر اپنے علوم کی زمرہ بندی اور نصابی سطح کو اس حد تک بڑھانا چاہیے جو جامعات کے شایان شان ہو۔

تیسرے، ہمیں انصاف کے معاملات کے اردگرد لوگوں کی حقیقی اقدار میں اضافے کی ضرورت ہے اور اصل میں یہاں میرے پاس ایک کتاب ہے جس کو میں نے حال ہی میں مرتب کیا ہے اور جس کا نام ہے: Shared values Constitutionalism and Democracy in Africa

(مشترکہ اقدار، دستوریت اور جمہوریت)۔ اس میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ چونکہ ہم نے افریقہ کی تاریخ اور جغرافیے سے نوآبادیاتی دور سے پہلے، دوران اور بعد میں مشترکہ اقدار کو اخذ نہیں کیا، اس لیے ہم ایک جامع افریقی تصورِ انصاف کی تعمیر نہیں کر سکے۔

چوتھے، ضرورت ہے کہ ہم فی الواقع اس بات کا جائزہ لیں کہ قانون کے ارتقا کے کون کون سے نئے شعبے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس ۱۹۸۱ء میں افریقی اتحاد کی تنظیم کا منظور شدہ انسانی اور عوامی حقوق کا افریقی منشور (چارٹر) موجود ہے۔ اس میں تاریخی طور پر پہلی بار ترقی کو ایک حق کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ کیا ہم اس کو اپنی یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں؟ نہیں، ہم نہیں پڑھاتے۔ کیا ہم نے اس کے گرد کوئی علمی وفکری کام کیا ہے؟ نہیں، ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم اس کے بجائے انسانی حقوق کی یورپی عدالت، امریکی اور پتہ نہیں اور کس کس کا حوالہ دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم سست ہیں، ہم علمی فروغ (اسکالرشپ) کے لیے کافی کام نہیں کرتے۔ ایسے شعبوں کے بارے میں ہم تحقیق نہیں کرتے اور اس کو شائع بھی نہیں کرتے تاکہ ہمارے حالات بہتر ہو سکیں لیکن ہم مسلسل کہتے رہتے ہیں ہمارا نصاب تبدیل نہیں ہوا۔ اگر ہم خود یہ کام نہیں کریں گے تو اور کون نصاب میں یہ تبدیلی ہمارے لیے کرے گا؟

ہمارے پاس ۲۰۰۱ء میں، ڈربن، جنوبی افریقہ میں منعقد ہونے والی ''نسلی امتیاز کے خلاف عالمی کانفرنس'' کے ایکشن پلان کی سفارشات موجود ہیں، جن میں نوآبادیاتی نظام کے لیے غلامی کی اصلاح وغیرہ کے مطالبات ہیں۔ کیا کسی افریقی یا ایشیائی قانونی اسکالر نے انہیں نصاب میں شامل کیا ہے؟ نہیں کیا۔ دوسرے الفاظ میں ہم سست (Bums) ہیں اور ہم مسئلے کا حصہ ہیں۔

جب لیبیا، مصر اور تیونس جیسے ممالک کے لیڈروں کا تختہ ان کے عوام کی جانب سے بیداری کی تحریکوں کے نتیجے میں الٹا جاتا ہے تو آپ اچانک سنتے ہیں کہ ان کے امریکہ میں، برطانیہ میں، سوئٹزرلینڈ میں اکاؤنٹ ضبط کیے جاتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ یہ موخر الذکر ممالک ہر وقت چوری کی لوٹی ہوئی دولت رکھتے ہیں۔

ہمیں اپنی یونیورسٹیوں میں ایسا قانونی نظام متعارف کرانے اور ایسے اقدامات کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں موثر طور پر یہ کہا جا سکے ''وہ اپنی تمام چوری کی ہوئی اس دولت کا اعلان کر دیں جو شمال (امریکہ) کے بنکوں میں آپ نے جمع کرا رکھی ہے۔ ایک ایسے بحران کا انتظار نہ کریں تا کہ جب وہ عوام، جن کا پیسہ لوٹ کر تم اپنی معیشت بنا رہے تھے، مشکل میں ہوں اور تم اچانک یہ کہو کہ ہمیں اس دولت کا انکشاف ابھی ہوا ہے، تو اس طرح آپ جھوٹ بول رہے ہوں گے۔'' ہمارے اکثر عدالتی نظاموں کے اندر جو شخص چوری کی جائیداد رکھتا ہے اس کا شمار مجرموں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں مجرموں کے ساتھ معاملہ کر رہے ہیں اور ہمارے اسکول ہمیں ضرورت کے مطابق تعلیم نہیں دے رہے ہیں تا کہ ہم حصول انصاف کے لیے جدوجہد کر سکیں۔

میں آخر میں یہ کہہ کر اپنی بات ختم کروں گا کہ ہمارے پاس افریقہ اور ایشیا میں اپنے قانون اور قانونی نظاموں کو نوآبادیاتی دور سے آزاد کرانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں اور ہمیں یہ کام بہر حال کرنا ہوگا۔ اگر ہم یہ کام نہیں کریں گے تو ہم تسلیم کر رہے ہیں کہ ہم نوآبادیاتی دور میں اور غلام رہنا چاہتے ہیں۔

[شادریک گوٹو (Shadrack Gutto) پریٹوریا، جنوبی افریقہ کی یونیورسٹی میں افریقی نشاۃ ثانیہ کے مطالعے کے ڈائریکٹر ہیں۔]

(ترجمہ: عارف الحق عارف)

Source: Third World Resurgence No. 266/267, October/November 2012, pp 42-43